گلبانگِ خیام

(عُمر خیام کی فارسی رُباعیوں کا منظوم اُردو ترجمہ)

مترجم

ڈاکٹر عصمت جاوید

گلبانگِ خیام

(عُمر خیام کی فارسی رُباعیوں کا منظوم اُردُو ترجمہ)

مترجم

ڈاکٹر عصمت جاوید



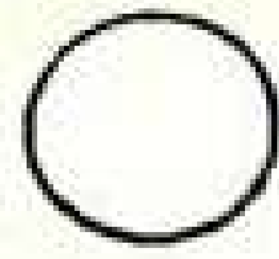
فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

بار اوّل ---------- ۱۹۹۱ء

مطبع --- فیروز سنز لاہور

مجلّد --- 969 0 01016 6



اُستادِ محترم

حضرت نکہت شاہجہانپوری کے نام

جنہوں نے مجھ میں چھپے ہوئے ادبی
ذوق کو دریافت کیا،
اسے سنوارا،
اور اس کی آبیاری کی!
اور یہ انتساب انہیں کے ذوقِ ادب
کا انعکاس ہے۔

عصمت جاوید

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

حرفِ آغاز

رباعیاتِ عمر خیام کا اُردو ترجمہ حاضرِ خدمت ہے۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل عمر خیام کی رباعیوں کے منظوم ترجمے دنیا کی ہر قابلِ ذکر زبان میں ہو چکے ہیں جن میں ہماری زبان اُردو بھی شامل ہے۔ آپ کو یہ سوچنے کا حق حاصل ہے کہ جب اردو میں مذکورہ رباعیوں کے درجنوں ترجمے ہو چکے ہیں تو عمر خیام پر یہ مزید کرم کیوں ؟ جواب یہ ہے کہ یہ ترجمہ اس یقین و اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس میں آپ کو کچھ ایسی باتیں ملیں گی جو اب تک کے کیے ہوئے ترجموں میں نہیں پائی جاتیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس مجموعے میں آپ کو رُباعیوں کی ترتیب رُدیف وار نہیں بلکہ باعتبارِ موضوع ملے گی جس سے آپ کو عمر خیام کے فلسفہ نشاط کی بنیادیں تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔ اس سے بھی بڑھ کر دوسری بات یہ کہ یہ ترجمہ شدہ رُباعیاں پڑھ کر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں نہ تو مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ اس قدر آزادی برتی گئی ہے کہ اصل و ترجمہ میں کوئی رشتہ ہی باقی نہ رہے یا برائے نام باقی رہے بلکہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ خیالات کے ساتھ ان سے لپٹے ہوئے

جذبات بھی ترجمے میں منتقل ہو جائیں اور ترجمے پر اصل کا گمان ہو۔ وہ ترجمہ ہی کیا جو اصل سے ملا کر پڑھنے کے بعد آپ کی سمجھ میں آئے یا آپ کو اچھا لگے۔ راقم نے ڈھائی سو سے زیادہ رباعیوں کا ترجمہ کیا ہے لیکن اس مجموعے میں صرف ڈیڑھ سو رباعیاں منتخب کی گئی ہیں۔ اس انتخاب میں ممکن ہے کچھ اچھی رباعیاں (عمر خیام کی) شامل ہونے سے رہ گئی ہوں۔ یہ بھی ممکن کیا بلکہ یقین ہے کہ اس مجموعے میں آپ کو ان رباعیوں کے ترجمے بھی ملیں گے جو الحاقی ہیں اور غلط طور پر عمر خیام سے منسوب ہو گئی ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے چھان پھٹک نہیں کی ہے بلکہ متداول نسخوں میں جس رباعی میں مجھے عمر خیام بولتا ہوا محسوس ہوا اسے آنکھ بند کر کے عمر خیام کی تخلیق سمجھ لیا، چاہے تحقیق کا فیصلہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

رباعی صرف چار مصرعوں کو جوڑنے کا نام نہیں ہے۔ اس کی بحریں مخصوص ہیں جو اسے دیگر اصنافِ سخن سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان بحور کی امتیازی خصوصیت وہ زحافات ہیں جن کی بدولت آہنگ بدلنے میں شاعر کو بڑی مدد ملتی ہے۔ رباعی میں آوازوں کا قافلہ کہیں "رُک رُک" اور رُک رُک کر آگے بڑھتا ہے تو کہیں اس میں موجوں کی تیز رفتاری بھی آجاتی ہے۔ رباعی میں اکثر طویل مصوتے دب کر اچھلتے ہیں اور آواز کی لہروں کا مخصوص پیٹرن بناتے ہیں۔ رباعی کی ایک مقبول بحر لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ (مفعول، مفاعیلُ، مفاعیلُ، فعول / فعل) ہے۔ اردو کے اکثر رباعی گو شعرا خود کو صرف اسی ایک وزن تک محدود کر لیتے ہیں اور

ان زحافات سے فائدہ نہیں اٹھاتے جن کی رباعی کی بحروں میں گنجائش رکھی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی رباعیاں یک سُرے پن (MONOTONY) کا شکار ہو جاتی ہیں۔ راقم الحروف نے ان ترجموں میں حتی الامکان اس عیب سے بچنے کی کوشش کی ہے۔

عمر خیام ایک ماہر رباعی گو تھا۔ فارسی زبان پر اسے حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ وہ قافیوں کو پانی کر دیتا تھا اور ان کی مدد سے اظہار معانی کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات کی تہیں کھولنے میں کمال رکھتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ لفظوں کے صحیح انتخاب کی مدد سے مناسب صوتی ماحول پیدا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت بھی رکھتا تھا اس لیے اس کی اکثر رباعیوں کا مفہوم (THOUGHT - CONTENT) تو دوسری زبانوں میں آسانی سے منتقل ہو جاتا ہے لیکن ترجمے کے عمل (PROCESS) میں یہ رباعیاں اپنا اصلی جوہر یعنی صوتی و جذباتی تاثر کھو دیتی ہیں۔ چوں کہ رباعی فارسی اور اردو دونوں کی مشترکہ صنفِ سخن ہے اور ادبی لفظیات بھی بڑی حد تک فارسی سے مستعار ہے۔ اس لیے اردو میں عمر خیام کی ہمہ جہتی نمائندگی کے نسبتاً بہتر امکانات موجود ہیں۔ افسوس کہ اب تک ان امکانات کو کھنگالنے کی کوئی قابلِ اعتنا کوشش نہیں کی گئی ہے اس لیے اردو قاری کو رباعیاتِ خیام کے بے جان اور بے اثر ترجموں سے سابقہ پڑتا آیا ہے۔ اس سمت میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ آپ پر ہی چھوڑنا مناسب ہے۔

عمر خیام کا نام زبان پر آتے ہی ہمارے ذہنوں میں ایک ایسے شخص کا پیکر ابھرتا ہے جس کے پہلو میں ساقی گلعذار اور ہاتھ میں جام شراب ہے اور جو دادِ عیش دینے ہی کو اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتا ہے لیکن اگر ہم عمر خیام کے فلسفۂ عشرتِ امروز کا بے لاگ تجزیہ کریں تو ہمیں اس فلسفے کی تہ میں شدتِ غم کا وہ جذبہ ملے گا جو خود آگہی کی دین ہوتا ہے۔ میری رائے میں عمر خیام صرف لذتیت (HEDONISM) یا (EPICUREANISM) کا شاعر نہیں ہے جیسا کہ اہلِ یورپ سمجھتے ہیں یورپی تہذیب کے مادی رُجحانات نے عمر خیام کے فلسفۂ عیش کو دل و جان سے قبول تو کر لیا مگر اس کی نظریں اس دردمندی، کسک، یاسیت، انسانی وجود کی بے بسی اور انسانی شعور کی نارسائی کے زخمی احساس تک نہ جا سکیں جو اس کے فلسفۂ نشاط کی تہ میں زیرِ آب موجوں کی طرح موجود رہے ہے۔ خیام کا درسِ عیش ایک جھنجھلاہٹ ہے۔ وہ انتقاماً اس دنیوی زندگی سے رس کا آخری قطرہ نچوڑنے پر زور دیتا ہے۔ یہ زندگی کے ساتھ گھاٹے پر کیا ہوا سمجھوتہ ہے۔ اس نے صرف ایک فلسفی کی حیثیت سے نظامِ کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی، اور ٹھوکر کھا گیا۔ اس کی نظریں دنیا کے اس عظیم ترین مذہبی و روحانی پیشوا کی طرف نہ اُٹھ سکیں جس نے حیات و ممات کے پیچیدہ اور عسیر الفہم مسائل کا حل ایک مربوط نظام کی شکل میں پیش کیا۔ اسی لیے خیام دنیا کی بے ثباتی، جبر مشیت اور موت کے ظاہری مظالم کے مسائل میں الجھ کر رہ گیا۔

یہی عمر خیام کے فلسفے کی بنیادی خامی ہے جو اسے ایسی سمت میں

لے جاتی ہے جو تباہی کا راستہ ہے۔ تعمیری ادب کی افادیت اور تعمیری فکر کی اہمیت کے احساس کو شدید تر بنانے کے لیے عمر خیام کی رباعیاں، ایک سیاہ پس منظر کی حیثیت رکھتی ہیں اور ع

من نکردم شما حذر بکنید

کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ تاہم عمر خیام کی آواز میں جادو ہے۔ ہم اس کے طرزِ بیان کی شوخی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرا قارئین کو صرف یہ مشورہ ہے کہ وہ رباعیاتِ خیام سے "محفوظ فاصلے" سے لطف اندوز ہوں اور ان اسکی کمزوریوں کو محسوس کرنے کی کوشش کریں جو فلسفۂ عمر خیام میں پوشیدہ ہیں۔

عصمت جاوید

ترتیب

حمد و مناجات

پابستۂ زنجیر پہ رحمت ہو تری
زندانیٔ تقدیر پہ رحمت ہو تری
میخانے کی سمت اُٹھتے قدموں پہ کرم
اِس دستِ قدح گیر پہ رحمت ہو تری



حیؔ کہ لبقدری سرد می سازد
پیوستہ ہمی کارِ عدو می سازد
گویند قرابہ گو مسلماں نبود
آں را تو ثنا گو کہ کدو می سازد



یارب! تری حکمت کے ہیں کیا کیا پہلو
مومن سے کہے تو نہ بنا جام و سبو
اور ہم سے گنہ گاروں کے پینے کو تو
تونبے بھی اُگاتا ہے سدا اللہ ہُو



بر سینۂ دل پذیرِ من، رحمت کُن

بر جان و دلِ اسیرِ من، رحمت کُن

بر پای خرابات روِ من بخشای

بر دستِ پیالہ گیرِ من رحمت کن



پابستۂ زنجیر پہ رحمت ہو تری

زندانیٔ تقدیر پہ رحمت ہو تری

میخانے کی سمت اُٹھتے قدموں پہ کرم

اس دستِ قدح گیر پہ رحمت ہو تری



سازندۂ کارِ مُردہ و زندہ توای
وارندۂ ایں چرخِ پراگندہ توای
من گرچہ بدم صاحبِ ایں بندہ توای
کس راچہ گنہ کہ آفرینندہ توای



اچھے کہ بُرے ہے سب کا رازق تو ہی
بیمار ہیں ہم، طبیبِ حاذق تو ہی
مانا کہ برا ہوں، ترا بندہ ہی تو ہوں
ہے کس کی خطا؟ مرا ہے خالق تو ہی



من بندۂ عاصیم، رضای تو کجاست
تاریک دلم، نورِ صفای تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی
این مزد بُود، لُطف وعطای تو کجاست



مولیٰ! دلِ عاصی بھی مکاں ہے تیرا
کر عفو خطا، عفو نشاں ہے تیرا
جنّت جو ملے مجھ کو عبادت کے عوض
اُجرت ہوئی، احسان کہاں ہے تیرا



احوالِ جہاں بر دلم آسان می کن
وافعالِ بدم زِ خلق پنہان می کن
امروز خوشم بدار و فردا با من
آنچہ ز کرم توی سزد آں می کن



مشکل مری آسان خدایا کرنا
دنیا پہ مرے عیب نہ افشا کرنا
رکھ آج تو خوش مجھ کو رہا کل کا حساب
کل جو بھی کرم کا ہو تقاضا کرنا



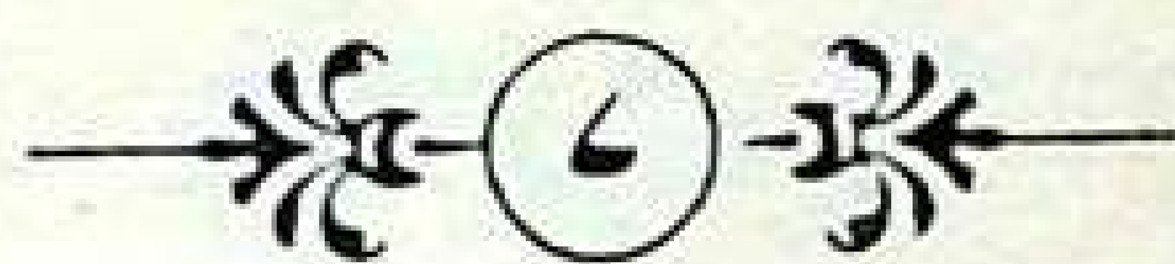
ای سوختہ ای سوختہ ای سوختنی
ای آتش دوزخ ز تو افروختنی
تا کہ گوئی کہ "بر عمر رحمت کن"
حق را تو کی بارحمت آموختنی



اے سوختنی، کشتنی، گردن زدنی
اچھی نہیں تیری یہ دریدہ دہنی
"رحمت ہو عمر پہ" کہہ کے دیتا ہے سبق
اس ذاتِ احد کو جو ہے رحمت سے بنی



ابریقِ می مرا شکستی ربّی
بر من درِ عیش را بہ بستی ربّی
بر خاک فگندی میٔ گلرنگِ مرا
خاکم بدہن! مگر تو مستی ربّی



کیوں توڑ دی میری یہ صراحی یارب
اک بندۂ عاجز سے یہ شوخی! یارب
مٹی میں ملا دی مری گلرنگ شراب
خاکم بدہن، ہے مست تو بھی یارب



ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرقِ میانِ من و تو چیست بگو



کیا کوئی گناہوں سے بچا، تو ہی بتا
بچ کر کوئی کس طرح جِیا؛ تو ہی بتا
میرے بُرے اعمال، بُرا تیرا سلوک
ہم دونوں میں کیا فرق رہا، تو ہی بتا



در ملکِ تو از طاعت من ہیچ فزود؟
وز معصیتی کہ رفت نقصانی بود؟
بگزار و مگیر زانکہ معلومم شد
گیرندۂ دیری و گزارندۂ زود



کیا میری عبادت سے ترا ملک بڑھا؟
یا میری برائی سے ترا کچھ بگڑا؟
اب سمجھا کہ کیوں دیر سے کرتا ہے گرفت
اور جلد خطا کاروں کو کرتا ہے رہا



فردا کہ نصیبِ نیک بختاں بخشند
قسمی بمنِ رندِ پریشاں بخشند
گر نیک یابم مرا بایشاں بخشند
ور بد باشم بدیشاں بخشند



نیکوں کو صلہ ملے گا، حسبِ دلخواہ
سنتا ہوں گنہ گاروں کے بخشنے کا گناہ
گر نیک نکل آؤں تو کر اُن میں شمار
بد ٹھہروں تو کر معاف اِن کے ہمراہ

توصیفِ شراب
و
آدابِ مے نوشی

لینا ہے تو لے جام سے تو درسِ عمل
ممکن نہیں اس رہبرِ کامل کا بدل
گر ہاتھ میں ہو جام تو مشکل کیسی
ہر مسئلہ ہوتا ہے مےِ ناب سے حل



تا زہرہ و مہ بر آسمانند پدید
بہتر ز مئے لعل کسی ہیچ ندید
من در عجبم ز می فروشان کایشاں!
بہ زانکہ فروشند چہ خواہند خرید



دیکھی نہیں بہتر کوئی شے اس شے سے
مہر و مہ و انجم بھی نہیں اس جیسے
حیرت میں ہوں مے بیچ کے اے بادہ فروش
کیا چیز خریدے گا تو بہتر مے سے



سیرِ دو جہاں از قدحِ مستانست
خورشید ازل جامِ مہِ تابانست
ایں نکتہ کہ در قلبِ جہاں پنہانست
در شیشۂ می اگر بدانی آنست



اک جام میں سرِّ دو جہاں پنہاں ہے
خورشید ازل جامِ مہِ تاباں ہے
وہ نکتہ جو اندرونِ عالم ہے نہاں
میں دیکھ کے ساغر میں بتادوں یاں ہے"

۱۳

تا کَی ز زاہد حدیث و تا کَی ز ازل
ہنگام طرب شراب را نیست بدل
بگذشت ز اندازۂ من علم و عمل
ہر مشکل را شراب گرداند حل

۱۳

لینا ہے تو لے جام سے تو درسِ عمل
ممکن نہیں اس رہبرِ کامل کا بدل
گر ہاتھ میں ہو جام تو مشکل کیسی؟
ہر مسئلہ ہوتا ہے مئے ناب سے حل

۱۴

مَی خور کہ ز تو کثرت و قلت ببرد
و اندیشۂ ہفتاد و دو ملّت ببرد
پرہیز مکن ز کیمیای کہ از ور
یک جرعۂ مَی ہزار علّت ببرد

۱۴

انساں کی ذلّت کا علاج اس میں ہے
ہفتاد و دو ملت کا علاج اس میں ہے
پرہیز نہ کر مے سے کہ اکسیر ہے یہ
پی لے کہ ہر اک لت کا علاج اس میں ہے



گر بادہ بکوہ بر زنی رقص کند
ناقص بود آنکہ بادہ را نقص کند
از بادہ مرا توبہ چرا فرمائی !
روحیست کہ او تربیتِ شخص کند



چھڑ کو جو اسے کوہ پہ، وہ رقص کرے
ناقص ہے وہ خود مے کو جو پُر نقص کرے
اس چیز سے انکار ہو کس کافر کو
یہ رُوح اگر تربیتِ شخص کرے



می قوتِ بدن قوّتِ جانست مرا
می کاشفِ اسرارِ نہانست مرا
دیگر طلبِ دنیا و عقبیٰ مکنید
یک جرعہ پر از ہر دو جہانست مرا



ہے قوتِ بدن، قوتِ جاں میرے لیے
مَے ہے کاشفِ اسرارِ نہاں میرے لیے
کیوں اور نئے دنیا و عقبیٰ مانگوں ؟
ساغر میں ہے جب ہر دو جہاں میرے لیے



از بادہ شود تکبّر از سرہا کم
وز بادہ شود کشادہ بندِ محکم
ابلیس اگر ز بادہ خوردی یک دم
کردی دو ھزار سجدہ پیشِ آدم



کرتی ہے مئے ناب تکبّر کو کم
کھل جاتے ہیں اس سے پل میں بندِ محکم
ابلیس جو تھوڑی سی بھی چکھتا اس دن
کرتا دو ہزار سجدے پیشِ آدم

(۱۸)

عاقل غمِ اندیشۂ لاشئ نخورد
جز جامِ لبالب پیاپی نخورد
غم در دل و بادہ در صراحی باشد
خاکش بر سرِ آن کہ غم خورد و مَی نخورد

(۱۸)

عاقل نہیں جو مے سی حسیں شے نہ پیئے
با نغمۂ نے، جام پیاپے نہ پیئے
غم دل میں اِدھر، اُدھر صراحی میں شراب
تف اس پہ جو غم کھائے مگر مے نہ پیئے

۱۹

بر رُوی نکوی و لب جوی گل و رد
تا توانم عیش و طرب خواهم کرد
تا بوده ام و باشم و خواہد بودن
مَی خوردم و مَی خورم و خواہم خورد

۱۹

اس راز سے واقف نہیں کوئی اب تک
میں رندِ بلا نوش رہوں گا کب تک
جیتا تھا میں جیتا ہوں جیوں گا جب تک
پیتا تھا میں پیتا ہوں پیوں گا تب تک



ای ہر ہمہ سروران عالم فیروز
دانی کہ وقت بود روح افروز
یک شنبہ، دوشنبہ وسہ شنبہ و چار
پنج شنبہ وآدینہ وشنبہ، ہمہ روز



پیتا ہوں انھیں دنوں میں، ورنہ ہر بار
میں ہاتھ لگاتا نہیں مے کو زنہار
پینے کے ہیں روز، پیر، منگل یا بدھ
یا جمعہ، جمعرات، سنیچر، اتوار

(۲۱)

امروز که آدینه مرا در نام است
می نوش کن در قدح چه جای جام است
هر روز اگر یک قدحِ می خوردی
امروز دو خور که سیّد الایام است

(۲۱)

کیوں کہتا ہے تو جمعہ کو پینا ہے حرام
میں کہتا ہوں دینا ہے تجھے گر اک جام
دے اس کی جگہ دو دو قدح اے ساقی
ہفتے کا یہی دن ہے امام الایام



امروز کہ نوبتِ جوانیٔ منست
مَی نوشم ازاں کہ کامرانیٔ منست
عیش مکنید زانکہ تلخ است خوش است
تلخ است ازانکہ زندگانیٔ منست



اب جبکہ مرا دورِ جوانی ہے یہ
پیتا ہوں کہ عشرت کی نشانی ہے یہ
اچھا ہے کہ مے تلخ ہے کیوں تلخ نہ ہو
آخر تو مری ہی زندگانی ہے یہ



یک جام ہزار مرد با دین ارزد
یک جرعۂ مَی مملکتِ چین ارزد
در روی زمین چیست زبادہ خوشتر
تلخی کہ ھزار جانِ شیریں ارزد



اک جام پہ لاکھ تاجِ زریں قرباں
اک جرعہ پہ سو مملکتِ چیں قرباں
مے جیسی نہیں کوئی حسیں شئے جس کی
تلخی پہ ھزار جانِ شیریں قرباں



وقتی کہ طلوعِ صبح ازرق باشد
باید کہ بکف جامِ مروّق باشد
گویند کہ حق تلخ بود در افواہ !
باید بہمہ حال کہ مَی حق باشد



پھر صبح نے اُلٹا ہے ورق اے ساقی
دے جامِ بلوریں میں شفق اے ساقی
سن، حق کو زمانہ تلخ کیوں کہتا ہے
کیونکہ ہے مئے تلخ ہی حق اے ساقی



خورشید کمندِ صبح بر بام افگند
کیخسروِ روز بادہ در جام افگند
مَی خور کہ منادیِ سحرگہ خیزاں
آوازۂ "اشربوا" در ایام افگند



خورشید نے پھینکی ہے سرِ بام کمند
ہے جام بکف دن کا نشۂ حوصلہ مند
پی لے، یہ عبادت ہے سحر خیزوں کی
ہے غلغلۂ "اشربوا" ہر سمت بلند



ہر روز بر آنم کہ کنم شب توبہ
از جام و پیالۂ لبالب توبہ
اکنون کہ رسید وقت گل ترکم دہ
در موسم گل ز توبہ یارب توبہ



ہر روز یہ نیت کہ کروں شب توبہ
اس جامِ لبالب سے کروں اب توبہ
اب جبکہ بہار آئی ہے رکھ مجھ کو معاف
اس حال میں توبہ سے بھی یارب توبہ



من می خورم و مخالفان از چپ و راست
گویند مخور بادہ کہ دیں را اعداست
چوں دانستم کہ می عدوئے دین است
واللہ بخورم خونِ عدو را کہ رواست



پیتا ہوں تو ہر طرف سے آتی ہے صدا
یہ دین کی دشمن ہے اسے منہ نہ لگا
جب مان لیا دین کی دشمن اس کو
دشمن کا لہو پینا بھی رکھوں نہ روا؟



گفتم کہ دگر بادۂ گلگون نخورم
می خونِ رزست و من دگر خون نخورم
پیرِ خردم گفت بجد میگوئی
گفتم کہ مزاح میکنم چون نخورم؟



قسم کھاؤں مگر شرابِ گلگوں نہ پیوں
مے خون ہے انگور کا میں خوں نہ پیوں
یہ سُن کے کہا پیرِ خرد نے "یہ کیوں"
میں نے کہا کرتا تھا ہنسی کیوں نہ پیوں؟

۲۹

امروز کہ نیست از شرابِ تاکم
زہری بود ار دہر دہد تریاکم
زہرست غمِ جہان و تریاکش می
تریاک خورم کہ زہر نبود باکم

۲۹

دنیا کا اسے ظلم کہو، مہر نہیں
پینے سے مجھے روکنا کیا قہر نہیں؟
ہے زہرِ غمِ جہاں کی تریاق شراب
تریاق میں پیتا ہوں کوئی زہر نہیں



گویند ازان کسان کہ با پرہیزند
زانسان کہ بمیرند چناں برخیزند
ما با مئے و معشوق ازانیم مدام
تا بو کہ بحشر مان چنان انگیزند



کہتے ہیں مرے جب کوئی ایمان کیساتھ
اُٹھے گا اسی حال میں وہ شان کیساتھ
اُٹھ سکتے ہیں ہم بھی مے و معشوق سمیت
پھر کیوں نہ سدا ان کو رکھیں جان کے ساتھ



چون فوت شوم بہ بادہ شوئید مرا
تلقین ز شراب و جام گوئید مرا
خواہید کہ روز حشر یابید مرا
از خاکِ درِ میکدہ بوئید مرا



مرنے پہ مئے ناب سے نہلاؤ مجھے
تلقین مے و جام سے گرماؤ مجھے
میخانے کی مٹی میں مری بو سونگھ
ملنا ہے جو محشر میں تو یوں پاؤ مجھے



ای ہم نفساں مرا بمی قوت کنید
ایں چہرۂ کہربا چو یاقوت کنید
چو فوت شوم بباده شوئید مرا
وز چوب رزم تختۂ تابوت کنید



جس وقت سفر ہو سوئے لاہوت مرا
مے ڈال کے چہرہ کردیا قوت مرا
میت کو مری غسل مئے ناب سے دو
انگور کی لکڑی کا ہو تابوت مرا



گویند کہ ماہِ رمضاں گشت پدید
من بعد بگرد بادہ نتواں گردید
در آخر شعبان خورم چنداں مئی
کاندر رمضان مست بفیتم تا عید



ماہِ رمضاں بن کے خطا پوش آئے
رندوں پہ نہ الزامِ خور و نوش آئے
مے آخرِ شعبان میں اتنی پی لیں
عیدِ رمضاں تک نہ ہمیں ہوش آئے



عید آمد کار رانکو خواہد کرد
ساقی مئِ ناب در سبو خواہد کرد
افسارِ نماز و پوز بندِ روزہ
عید از سرِ خران فرو خواہد کرد



ہے عید کا دن آج بھلا کون ڈرے
میخانے کی جانب چلیے رندوں کے پرے
گردن سے اتار کر جوا روزوں کا
کچھ بیل بھی چھوٹے ہیں خدا خیر کرے



دی شب ز سرِ صدق و صفائے دلِ من
در میکدہ آن روح فزای دلِ من
جامی بمن آورد کہ لبستان و بنوش
گفتم نخورم گفت "برای دلِ من"



میخانے میں تھی ایک حسینہ کافر
اک دن مجھے خوب اس نے پلا دی اور پھر
اک اور دیا جام کہ لے، پر میں نے
"اونہوں" جو کہا تو بولی "میری خاطر"

(۳۶)

گر دست دہد ز مغزِ گندم نانی
وز می دو منی، ز گوسپندی رانی
با ماہ رخی نشستہ در ویرانی
عیش است کہ نیست حدِ ہر سلطانی

(۳۶)

ویرانہ ہو، مے نوشی کا سامان بھی ہو
روٹی بھی ہو، بکرے کی بھُنی ران بھی ہو
معشوقِ طرحدار بھی ہو پہلو میں
پھر اپنی بلا سے کوئی سلطان بھی ہو



ای وای بران دل که درد سوزی نیست
سوده زدهٔ مہر دل افروزی نیست
روزی که تو بی باده، بسر خواہی برد
ضائع تر ازان روز تر اروزی نیست



وہ دل بھی کوئی دل ہے جو پُرسوز نہیں
سودہ زدۂ مہر دل افروز نہیں
جو روز ترا بسر ہو بے جام شراب
اس روز سا برباد کوئی روز نہیں



تا باز شناختم من این پای ز دست
این چرخِ فرو مایہ مرا دست بہ بست
افسوس کہ در حساب خواہند نہاد
عمرِی کہ مرا بی می و معشوق گزشت



پیدا جو ہوئے مجھ میں سمجھ کے آثار
دیکھا کہ ہوں محرومیٔ قسمت کا شکار
جو بیت گئی بے مے و معشوق، افسوس
اس کو بھی مری عمر میں کرتے ہیں شمار

(۳۹)

گویند شراب و حور عین خواہد بود
وانجا مئے ناب و انگبین خواہد بود
گر ما مئے و معشوق پرستیم رواست
چون عاقبت کار ہمین خواہد بود

(۳۹)

جنّت میں بھی گر شغل مے و مینا ہے
حوروں کی جو صحبت میں وہاں پینا ہے
اپنی مے و معشوق پرستی ہے روا
آخر تو اسی طور وہاں جینا ہے



جامی و مَی و ساقی بر لبِ کشت
ایں جملہ مرا دہم مرا گشت بہشت
مشنو سخنِ بہشت و دوزخ از کس
کی رفت بدوزخ و کی آمد ز بہشت



جنت سے ہے کیا کم جو ہمیں حور سرشت
پلوائیں مئے لعل بٹھا کر لبِ کشت
یہ تذکرہ دوزخ و جنت کیسا؟
دوزخ سے ہم آئے نہ گئے آپ بہشت



گویند مرا چو سور حور خوشست
من می گویم کہ دختِ انگور خوشست
ایں نقد بگیر دست از نسیہ بشو،
کاوازِ دُہل شنیدن از دُور خوشست



ہر چند کہ جنّت کی ہیں حوریں انمول
حوروں کو مگر دخترِ رز سے مت تول
اس نقد کو لے ادھار جنت کو چھوڑ
کہتے ہیں سہانے ہیں بڑے دُور کے ڈھول



گویند شراب و حوضِ کوثر باشد
وانجامیِ ناب و شہد و شکر باشد
پُر کن قدح بادہ و بر دستم نہ
نقدی ز ہزار نسیہ بہتر باشد



کہتے ہیں کہ جنّت میں ہے حوضِ کوثر
پینے کے لیے شہد ہے کھانے کو ثمر
دے بھر کے تو پیالہ کہ یہ باتیں ہیں ادھار
اس سے تو یہ نقد لاکھ درجہ بہتر



مارا گویند دوزخی باشد مست
قولیست خلاف، دل درو نتواں بست
گر عاشقِ مست دوزخی خواہد بود
فردا بینی بہشت ہمچو کفِ دست



کہتے ہیں کہ میخواروں کا دوزخ ہے مکاں
یہ قول ہے جھوٹ، اس پہ نہ لاؤ ایماں
دوزخ میں گئے مست تو کوئی دن میں
فردوس نظر آئے گی چٹیل میداں



با مطرب و مَی و حورِ سرشتی گر ہست
با آبِ رواں و لبِ کشتی گر ہست
بہ زیں مطلب، دوزخِ فرسودہ عتاب
حقا کہ جز ایں نیست، بہشتی گر ہست



مطرب ہے، لبِ جُو ہے، مے عشرت ہے
پینے کو حسینوں کی حسیں صحبت ہے
کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی جنت ہوگی
ہوگی فقط ایسی ہی، اگر جنّت ہے



گر بادہ خوری تو با خردمندان خور
یا با صنمی سادہ رخی خندان خور
بسیار مخور، ورد مکن، فاش مساز
اندک خور و گہ گاہ خور و پنہاں خور



پینا ہے تو جا، اہلِ خرد کے گھر پی
پلوائے اگر خندہ جبیں دل بر، پی
پی کر نہ ہو دھت، روز نہ پی، غل نہ مچا
کم کم پی، کبھی کبھی پی، چھپ چھپ کر پی



می گرچہ حرامست ولی تا کہ خورد
وز گاہ چہ مقدار و اگر با کہ خورد
آنگاہ کہ ایں چہار شرط آمد
پس می خورد مردم دانا کہ خورد



یہ طے ہو پئیں کہاں پہ، کس سے مل کر
کتنی ہو وہ، کب تک چلے دورِ ساغر
ہو جائیں اگر یہ چار شرطیں پوری
پھر کون پیے اگر نہ پئیں اہلِ نظر



چوں بادہ خوری ز عقل بیگانہ مشو
مدہوش مباش جہل را خانہ مشو
خواہی کہ مئے لعل حلالت باشد
آزارِ کسی مجو، و دیوانہ مشو،



پینا ہے تو پھر عقل سے بیگانہ نہ بن
اور باعثِ رسوائی مے خانہ نہ بن
کرنا ہے اگر خود پہ مئے لعل حلال
پی کر نہ ستا اوروں کو، دیوانہ نہ بن!



دانی کہ چراست توبہ ناکردنِ من
زیرا کہ حرام نیست مے خوردنِ من
بر اہلِ مجاز ست بہ تحقیق حرام
مے خوردنِ اہلِ راز در گردنِ من



جب مے نہ حرام کی گئی ہو مجھ پر
میں پینے سے کیوں توبہ کروں ؟ توبہ کر
ناداں جو پیے تو لوں نہ اس کا ذمہ
دانا جو پیے، اس کا گنہ میرے سر



چوں ہشیارم، از من طرب پنہانست
چوں مست شوم در خردم نقصانست
حالیست میانِ مستی و ہشیاری
من بندۂ آن کہ زندگانی آنست



باہوش رہوں تو مجھ سے پنہاں ہو خوشی
گر مست رہوں، خرد میں آتی ہے کمی
اک حال ہے درمیانِ ہوش و مستی
اس حال پہ مرتا ہوں کہ جینا ہے یہی



سنت کن و فریضه ها را مگذار
وایں لقمه که داری زکساں باز مدار
غیبت مکن و دلِ کسی را میازار
در عهدهٔ آن، جانِ منم، باده بیار



ہوں فرض ادا اور ہو سنت پہ نظر
لقمے سے کسی شخص کو محروم نہ کر
غیبت نہ کسی کی ہو، نہ دل آزاری
آ! عہد کریں یہ مل کے جام مے پر

اجل

ماہیِ زمیں سے تا بلندیِ زحل
تھی کون سی مشکل جو ہوئی ہم سے نہ حل
ہر بند سے آزاد ہوئے پر افسوس
ہم سے نہ کھُلا، پر نہ کھلا بندِ اجل



از جرمِ حضیضِ خاک تا اوجِ زحل
کردہ ہمہ مشکلاتِ گردوں راحل
بیروں جستم زبندِ ہر مکر و حیل
ہر بند کشادہ شد مگر بندِ اجل



ماہیِ زمیں سے تا بلندی زحل
تھی کون سی مشکل جو ہوئی ہم سے نہ حل
ہر بند سے آزاد ہوئے پر افسوس
ہم سے نہ کھلا، پر نہ کھلا بندِ اجل

۵۲

خیّام کہ خیمہ ہای حکمت می دوخت
در کوزۂ غم فتادہ ناگاہ بسوخت
مقراضِ اجل طنابِ عمرش بہ بُرید
دلالِ قضا بہ رائیگانش بفروخت

۵۲

خیّام کہ فلسفے کے سیتا تھا خیام
بھٹی میں گرا غم کی ہوا بھسم تمام
کاٹی جو اجل نے اس کی ہستی کی طناب
دلّالِ قضا نے اسے بیچا بے دام



خیّام تنت بخیمہ ای ماند راست
سلطان روحست و منزلش دارِ بقاست
فرّاشِ رجل ز بہرِ دیگر منزل
از پا فگند خیمہ چوں سلطاں برخاست



خیّام بدن خیمہ ہے اور اس میں یہ جاں
سلطاں ہے جو ہے راہروِ مُلکِ جناں
فرّاشِ اجل اکھاڑ دے گا خیمہ
نکلے گا سفر پہ جب گھڑی یہ سلطاں!



عمرِ تو چہ دو صد و چہ سی صد چہ ہزار
زین کہنہ سرای بروں بُرْدنت ناچار
گر پادشہی وگر گدای بازار
وین ہر دو بیک نرخ بود آخرِ کار



دنیا میں تو سو سال جیے یا کہ ہزار
جانا ہی پڑے گا تجھے اک دن ناچار
ہو چاہے تو سلطاں کہ گدائے بازار
اک بھاؤ ہی بکنا ہے تجھے آخر کار



گردوں ز زمیں ہیچ گُلی بر نارد
کش نشکند و باز بگِل بسپارد
گر ابر چو آب خاک را بر دارد
تا حشر ہمہ خونِ عزیزان بارد



آتا ہے جو گل خاک کے پردے سے نکل
آخر میں اسی کو خاک جاتی ہے نِگل
گر خاک زمیں سے اُڑ کے بنتی بادل
پانی کی جگہ خون سے ہوتا جل تھل



ای چرخِ فلک خرابی از کینهٔ تست
بیدادگری پیشهٔ دیرینهٔ تست
ای خاک اگر سینهٔ تو بشگافند
بس گوہر قیمتی کہ در سینهٔ تست



اے چرخ، بچا کون ترے کینے سے
عاجز ترے ہاتھوں ہیں سبھی جینے سے
اے خاک! اگر ترا یہ سینہ چیریں
گوہر کئی نکلیں گے ترے سینے سے



افسوس کہ سرمایہ زکف بیروں شد
در دست اجل بسی جگر ہا خون شد
کس نآید ازاں جہاں کہ پرسیدم ازو
احوالِ مسافرانِ عالم چوں شد



سرمایۂ ہستی پہ نہ کیوں کر روؤں
ہے دستِ اجل سے سب کے سینے پرخوں
لوٹا نہ کوئی عدم سے، پھر میں کس سے
احوالِ مسافرانِ عالم پوچھوں ؟



برفرشِ خاک خفتگان می بینم
در زیرِ زمیں نہفتگان می بینم
چندانکہ بصحرای عدم می نگرم
نامدگان و رفتگان می بینم



کتنوں کو یہاں نیند کے ماتے دیکھا
کتنوں کو لحد میں مُنہ چھپاتے دیکھا
لوگوں کا بڑا ہجوم ہم نے دن رات
صحرائے عدم میں آتے جاتے دیکھا

۵۹

آن قصر کہ بہرام درو جام گرفت
روبہ بچہ کرد و شیر آرام گرفت
بہرام کہ گور می گرفتی دائم !
امروز نگر کہ گور بہرام گرفت

۵۹

افسوس کہ بہرام جہاں پیتا تھا جام
واں لومڑی بچے دے، کرے شیر آرام
پنجے میں کل اس کے گورِ خر تھا اور آج
خود گور کے پنجے میں پھنسا ہے بہرام



عاقل بچہ امید در این شوم سرا
بر دولت او دل نہد از بہر خدا
ہرگاہ کہ خواہد کہ نشیند از پا؛
گیرد اجلش دست کہ "بالا بیا"



پڑتا ہے یہاں جو عیش و عشرت میں خلل
عاقل کو کبھی راس نہ آئے یہ محل
آکر ابھی بیٹھا بھی نہ تھا محفل میں
فوراً یہ کہا اجل نے "اُٹھ اوپر چل"



در دائرۂ سپہرِ ناپیدا غور
جامیست کہ جملہ را چشانند بہ دَور
نوبت چو بہ دورِ تو رسد، آہ مکن
می نوش بخوشدلی کہ دور است نہ جور



اس دورِ فلک میں ہے عجب حبس کا طور
پاتا ہے ہر اک جامِ اجل دور بہ دور
باری تری آئی ہے تو پھر کیوں یہ جھجک
مت ظلم سمجھ اس کو چڑھالے فی الفور



یارانِ موافق ہمہ از دست شدند
در پای اجل یگان یگان پست شدند
بودند بیک شراب در مجلس عمر
دَوری دو سہ پیشتر مست شدند



ساتھی جو گئے تو پھر نہ دیکھا مُڑ کے
وہ موت کی آغوش میں پہنچے اُڑ کے
ساتھ آئے تھے ہم عمر کے میخانے میں
پر ہم سے دو اک دور وہ پہلے لڑھکے



چون چرخ بکام یک خردمند نگشت
خواہی تو فلک ہفت شمر خواہی ہشت
چوں باید مُرد آرزوہا ہمہ ہیچ
چہ مور خورد بگور چہ گرگ بہ دشت



جب ایک بھی مرضی پہ ہماری نہ چلا
وہ سات ہوں یا آٹھ فلک ہم کو کیا؛
مرنا ہے تو پھر لاش کا کیا، کوئی بھی کھائے
وہ قبر کے کیڑے ہوں کہ گرگِ صحرا



عمرت تا کی بخود پرستی گزرد
یا در پئ نیستی و ہستی گزرد
می خور کہ چنیں عمر کہ غم در پئ اوست
آن بہ کہ بخواب یا بہ مستی گزرد



کب تک یہ حیات خود پرستی میں کٹے
اندیشۂ نیستی و ہستی میں کٹے
پی لے کہ ہے جب عمر کی قسمت میں فنا
یا خواب میں کٹ جائے یا مستی میں کٹے



آمد سحری ندا ز میخانۂ ما
کای رندِ خراباتیِ دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مَے
زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما



گونجی یہ صدا صبحِ سرِ میخانہ
کس سوچ میں بیٹھا ہے مرا دیوانہ
اُٹھ، بھر دے شرابِ ناب پیمانے میں
قبل اس کے کہ بھر جائے ترا پیمانہ



برگیر ز خود حساب اگر باخبری
کاوّل تو چه آوردی و آخر چه بری
گوئی نخوری باده که میباید مُرد
میباید مرد گر خوری یا نخوری !



عاقل ہو تو خود حساب کر کے دیکھو
کیا لائے تھے، کیا لے کے چلے یہ سوچو
بس کہتے ہو "مت پی کہ ہے مرنا اک روز"
اک روز تو مرنا ہے پیو یا نہ پیو



دریاب کہ از رُوح جدا خواہی رفت
در پردۂ اسرارِ فنا خواہی رفت!
مَی خور کہ ندانی زکجا آمدہ ای
خوش زی چو ندانی کہ کجا خواہی رفت



سب چھوڑ کے یہ تن، یہ مکاں جانا ہے
یہ بھی کہاں معلوم جہاں جانا ہے
پی لے، نہیں معلوم کہاں سے آیا
جی لے، نہیں معلوم کہاں جانا ہے



تا کی دم آن خورم کہ دارم یا نئ
وین عمر بخوشدلی گزارم یا نئ
پر کن قدحِ بادہ کہ معلومم نیست
کایں دم کہ فرو برم بر آرم یا نئ



مت سوچ کہ ہے پاس ترے زر کہ نہیں
یہ سوچ جیے گا تو گھڑی بھر کہ نہیں
بھر لے قدحِ بادہ کہ معلوم کسے
لی سانس تو پھر ہو گی وہ باہر کہ نہیں

۶۹

مہتاب بنور دامنِ شب بشگافت
مَی خور کہ دمی خوشتر ازین نتواں یافت
خوش باش بیندیش کہ مہتاب بسی
اندر سرِ خاک سر بسر خواہد یافت!

۶۹

وہ دیکھ نکل آیا ہے ماہِ شب تاب
لا جام پلا، وقت بڑا ہے نایاب
یہ سوچ کے کھل کھیل کہ کتنے مہتاب
ہیں خاک کی آغوش میں آسودۂ خواب



بشگفت شگوفهٔ مئی بیار ای ساقی ؛
دست از عملِ زہد بدار ای ساقی
زان پیش کہ اجل کمین کند چندی روز
جام مئِ لعل و روی یار ای ساقی



لا جام کہ آئی ہے بہار اے ساقی
جامہ یہ تقدس کا اتار اے ساقی
قبل اس کے کہ ہو اجل کی یورش کچھ روز
جامِ مئے لعل و روئے یار اے ساقی



زاں پیش کہ غمہاتِ شبیخوں آرند
فرمای کہ تا بادۂ گل گوں آرند
تو زر نہ ای ای عاقلِ ناداں کہ ترا
در خاک نہند و باز بیروں آرند



قبل اس کے کہ موت تجھ پہ کرے حملہ
دے حکم "اے ساقی تو مئے گلگوں لا"
انساں ہے تو، سونا تو نہیں اے ناداں
پھر گاڑ کے کیوں تجھ کو نکالیں گے بتا



مَی خور کہ بزیرِ گِل بسی خواہی خفت
بی مونس و بی حریف و بی ہمدم جفت
زنہار بکس مگو ایں رازِ نہفت
ہر لالہ کہ پژمرد نخواہد بشگفت!



کونا جو لحد کا مر کے دل نے پایا
ساتھی کوئی پھر اس کو نہ ملنے پایا
پی لے کہ ہے یہ فرصتِ ہستی اک بار
مرجھا کے کبھی پھول نہ کھلنے پایا



ہر سبزہ کہ برکنارِ جوی رُستست
گویا ز لبِ فرشتہ خوی رستست
پا بر سرِ سبزہ بخواری نہ نہی !
کان سبزہ ز خاکِ لالہ روی رستست



یہ سبزہ جو ہے کنارِ جو سے پھوٹا
گویا ہے لبِ فرشتہ خو سے پھُوٹا
اس کو تو حقارت سے خدارا نہ کچل
یہ سبزہ ہے خاکِ لالہ رو سے پھوٹا



چوں می ندہد اجل امان اے ساقی
دردہ قدح شراب، ہان ای ساقی
غم خوردن بیہودہ نہ کارِ دل ماست
با این دو سہ روزہ در جہان ای ساقی



دیتی ہے کہاں اجل اماں اے ساقی
دے بھر کے مجھے رطلِ گراں اے ساقی
رونے میں انہیں بھی میں کروں کیوں برباد
دو روز تو جینا ہے یہاں اے ساقی



ساقی گل و سبزہ بس طربناک شدست
دریاب کہ ہفتۂ دگر خاک شدہ ست
می نوش و گل بچین کہ چوں در نگری
گل خاک شدہ ست و سبزہ خاشاک شدست



پھر منظرِ گلزار طربناک ہوا !
دامانِ گلِ بہار صد چاک ہوا
پی لے کہ نہ کہنا پڑے اگلے ہفتے
گل خاک ہوا، سبزہ بھی خاشاک ہوا



ای دل ہمہ اسباب جہاں خاستہ گیر
باغِ طربت بہ سبزہ آراستہ گیر
وانگاہ بران سبزہ شبی چوں شبنم
بنشستہ و بامداد خاستہ گیر



اے دل تو ہر اک لطف کو پایا ہوا جان
سبزے سے گلستاں کو سجایا ہوا جان
اس سبزے پہ شبنم سا تو خود کو شب بھر
بیٹھا پہ دمِ صبح اٹھایا ہوا جان

(۷۷)

از عمر تو چوں کہ می ترا شد شب و روز
مگذار کہ بر تو خاک باشد شب و روز
روز و شب خویش را بشادی گزران
ای بسکہ نباشی تو و باشد شب و روز

(۷۷)

ہر چند کہ ہیں میرے ملاقی شب و روز
گھٹتے ہیں مری عمر سے ساقی شب و روز
ہنس ہنس کے گزاروں یہ شب و روز نہ کیوں
چل دوں گا میں، رہ جائیں گے باقی شب و روز



یاران چوں باتفاق میعاد کنید
خود را بجمالِ یک دگر شاد کنید
ساقی چوں مَیِ مغانہ در کف گیرد !
بے چارہ فلاں را بدعا یاد کنید



جب دوست مرے میکدہ آباد کریں
اور اپنوں کے دیدار سے دل شاد کریں
لیتے ہوئے پیمانۂ مَے ساقی سے
اس ابنِ فلاں کو بھی کبھی یاد کریں

دُنیا

وہ کہنہ سرا جس کا ہے دنیا اک نام
ہے عرصہ گہہ ابلقِ دورِ ایام
وہ بزم کہ سوئے ہیں جہاں سو جمشید
وہ قصر کہ جس میں ہیں پڑے سو بہرام

۷۹

ایں کہنہ رباط کہ عالم نامست
آرام گہ ابلقِ صبح و شام است
بزمیست کہ درماندۂ صد جمشید است
قصریست کہ تکیہ گہ صد بہرام است

۷۹

وہ کہنہ سرا ہے جس کا 'دنیا' اک نام
ہے عرصہ گہِ ابلقِ دورِ ایّام
وہ بزم کہ سوئے ہیں جہاں سو جمشید
وہ قصر کہ جس میں ہیں پڑے سو بہرام



گاویست بر آسمان نامش پروین
یک گاوِ دگر نهفتہ در زیرِ زمین
چشمِ خردت کشای چوں اہلِ یقین
زیر و زبرِ گاوُ مشتی خر بیں



اک گاوِ فلک ہے نام جس کا پرویں
اک وہ ہے جسے کہتے ہیں سب گاوِ زمیں
اِن دونوں کے اوپر تلے تو اے دانا
پائے گا کئی گدھے بطوقِ زریں



چوں نیست درین زمانہ سودی ز خرد
جز بی خرد از زمانہ بر می نخورد !
پیش آر ز انکہ او خرد را ببرد
تا بو کہ زمانہ سوی ما نگرد !



بے کار و زبوں حال ہیں یاں اہلِ خرد
دنیا کا کرم ہے احمقوں پر بے حد
دے جام کہ ہم عقل کو رخصت کر دیں
پھر ہم پہ زمانے کی نظر ہو شاید



دورانِ جہان بی مَی و ساقی، ہیچ است
بی زمزمۂ نای عراقی، ہیچ است
ہر چند در احوالِ جہاں می نگرم
حاصل ہمہ عشرتست باقی، ہیچ است



یہ کارِ جہاں بے مے و ساقی ہے ہیچ
بے زمزمۂ نائے عراقی ہے ہیچ
ہر حال میں دیکھا ہے تجھے اے دنیا
حاصل ترا بس عیش ہے باقی ہے ہیچ



با یارِ خوشم جامِ شراب اولیٰ تر
وز دستِ غمت دیدہ پرآب اولیٰ تر
چون عالمِ دون وفا نخواہد کردن
در عالمِ دون مست و خراب اولیٰ تر



صحبت میں حسیناؤں کی پینا بہتر
رونے سے تو شغلِ مے و مینا بہتر
دنیائے دنی کس سے وفا کرتی ہے
دنیائے دُنی میں مست جینا بہتر



برخیز مخور غمِ جہانِ گزران
خوش باش دمی بشادمانی گزران
در طبع جہان اگر وفای بودی
نوبت بخودت نیامدی از دگران



ہرگز تو نہ کر غمِ جہانِ گزراں
ہنستے ہوئے رخصت اسے کر اے ناداں
ہوتی جو وفا اس میں تو پھر تیرے پاس
یہ چھوڑ کے ساتھ اوروں کا آتی بھی کہاں



می خوردن و شاد بودن آئینِ منست
فارغ بودن زکفر و دین دینِ منست
گفتم بعروسِ دہر کابینِ تو چیست
گفتا دلِ خرم تو کابینِ منست



نے کفر پرستی ہے نہ ایماں کی نفی
پینے سے ہے مقصود مرا صرف خوشی
دنیا کو بناتے ہوئے دلہن پوچھا
"کیا مہر ہے تیرا ؟" تو کہا "زندہ دلی"



۸۶

در عالم جان بہوش می باید بود
در کارِ جہان خموش می باید بود
تا چشم و زبان و گوش برجا باشد
بی چشم و زبان و گوش می باید بود



۸۶

دنیا میں عیوب پوش رہنا ہوگا
ہر لحظہ ہمیں خموش رہنا ہوگا
باچشم و زبان و گوش رہنا ہے اگر
بے چشم و زبان و گوش رہنا ہوگا!



کم کن طمع از جہان کہ میری خورسند
از نیک و بد زمانہ بگسل پیوند !
خوش باش دمی چنانکہ این دورِ فلک
ہم بگسلد و نماند ایں روزی چند



خوش خوش جو تجھے یہاں سے اُٹھنا ہے پسند
دنیا کی کسی چیز سے مت رکھ پیوند
ہنس کھیل کہ رُک جائے گا یہ دورِ فلک
مِٹ جائیں ساتھ اس کے یہی لمحے چند



من دامنِ زہد و توبہ طی خواھم کرد
با موی سفید قصدِ می خواھم کرد
پیمانۂ عمر من بہفتاد رسید
ایں دم نکنم نشاط کی خواہم کرد؟



کیا اب بھی مے و سبو کا ارماں نہ کروں
پیرانہ سری میں قصدِ عصیاں نہ کروں
ستّر کے قریب عمر ہونے آئی
کیا اب بھی تعیش کا میں ساماں نہ کروں؟

۸۹

تا چند ازیں حیلہ و زراقیٔ عمر
تا چند مرا درد دہد ساقیٔ عمر
حتّٰی کہ من از ستیزہ و دغدغہ اش
چوں جرعہ نجاک ریزم ایں باقیٔ عمر

۸۹

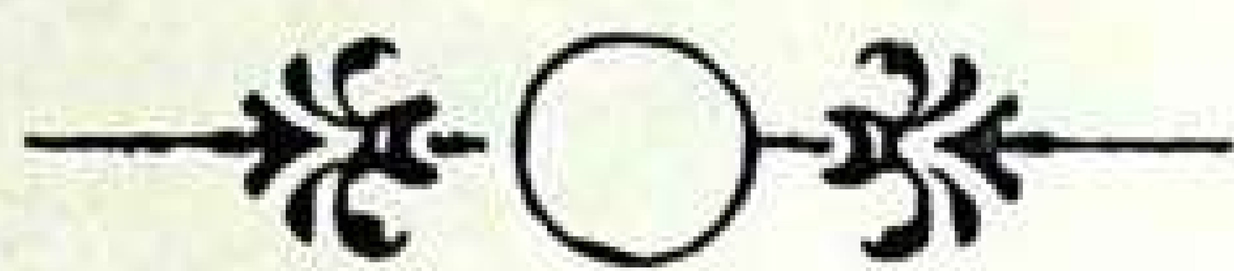
افسوس کہ ہے حیلہ و زراقیٔ عمر
دیتی ہے کچوکے مجھے اے ساقیٔ عمر
گھبرا کے اسی لیے تو ساغر ساغر
مٹی میں لنڈھاتا ہوں میں یہ باقیٔ عمر



چندیں غمِ بیہودہ مخور، شاد بزی
اندر رہِ بیداد تو با داد بزی
چوں آخرِ کار ایں جہان نیستی ہست
انگار کہ نیستی و آزاد بزی



حاصل نہیں کچھ جان کی بربادی سے
چل دیتا ہے اک روز جو اس وادی سے
دنیا کو تو ہونا ہی ہے اک دن معدوم
معدوم سمجھ خود کو، جی آزادی سے



کوزہ نامہ

کوزوں کی دُکاں پر جو گیا میں مدہوش
دیکھے دو ہزار کوزے گویا و خموش
آتی تھی صدا کوزوں سے "ہم میں گم ہیں
سب کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش



۹۱

درکارگہہ کوزہ گراں بودم دوش
دیدم دو ھزار کوزہ گویا وخموش
ہر یک بزبانِ حال با من گفتند
کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

۹۱

کوزوں کی دکاں پر جو گیا میں مدہوش
دیکھے دو ہزار کوزے گویا وخموش
آتی تھی صدا کوزوں سے "ہم ہیں گم ہیں
سب کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

۹۲

تا دیگِ بقای من بود اندر جوش
در کاسۂ خوشدلی کنم دُردی نوش
اے کوزہ گر از گلم اگر کوزہ کنی
آں کوزہ بجز بہ می فروشاں مفروش

۹۲

اے کوزہ گرو یاد رکھو میری یہ بات
مرنے پہ نہ چھوٹے مرا میخواروں کا سات
مٹی سے اگر میری بناؤ کوزہ
تم بیچو اسے بادہ فروشوں ہی کے ہات



دارندہ چون ترکیب طبائع آراست
از بہر چہ اوفگندش اندر کم و کاست
گر نیک آمد شکستن از بہر چہ بود؟
ور نیک نیامد ایں صُوَر عیب کراست؟



کیا صانع قدرت کو تھا اس سے منظور
یہ راز سمجھنے سے ہوں اب تک معذور
صورت اگر اچھی تھی اسے توڑا کیوں؟
صورت جو بُری تھی تو یہ ہے کس کا قصور؟

(۹۴)

جامیست کہ عقل آفریں می زدنش
صد بوسہ ز مہر بر جبیں می زدنش
ایں کوزہ گرِ دہر چنیں جامِ لطیف
میسازد و باز بر زمیں می زدنش

(۹۴)

وہ جام کہ جس پر کرے عش عش گردوں
ہیں حسن پہ جس کے ماہ و پرویں مفتوں
پھر کوزہ گرِ دھر یہی جامِ نفیس
اس طرح بنا کے توڑ دیتا ہے کیوں

۹۵

ترکیبِ پیالہ ای کہ درمی پیوست
بشکستنِ آن روانمی دار دست
چندین سر و پای نازنینانِ جہان
از مہر کہ پیوست و بکینِ کہ شکست؟

۹۵

مے جس سے رُسے وہ پیالہ توڑا کس نے
مستوں کی روش سے منہ یہ موڑا کس نے
جوڑے سے تھے سر و پائے حسیناں اس نے
مٹی میں انہیں ملا کے چھوڑا کس نے



این کوزه چو من عاشقِ زاری بودست
در بندِ سرِ زلفِ نگاری بودست؛
این دسته که در گردنِ وی می بینی؛
دستی ست که در گردنِ یاری بودست



یہ کوزہ بھی اک عاشقِ کامل تھا کبھی
میری ہی طرح حسن پہ مائل تھا کبھی
دستہ نہ کہو، یہ ہاتھ عاشق کا ہے
جو یار کی گردن میں حمائل تھا کبھی



بردار پیالہ و سبو اے دلجو
برگیر بگردِ سبزہ زار و لبِ جو
کین چرخ بسی قدِ بتانِ مہرو
صد بار پیالہ کرد و صد بار سبو



کر پیش پیالہ و سبو اے گلرو
آ بیٹھ کے ہم عیش منائیں لبِ جو
اس چرخ کے چکر پہ حسینانِ جہاں
سو مرتبہ پیالہ بنے سو بار سبو



تا چند ز مسجد و نماز و روزه
در میکده‌ها مست شو از دریوزه
خیام بخور باده که این خاک ترا
گه جام کنند، گه سبو، گه کوزه



کس کام کی یہ زندگیٔ دو روزہ
بہتر ہے کہ میخانے میں کر دریوزہ
خیام چڑھا جام کہ مٹی سے تری
کل جام بنائیں گے تو پرسوں کوزہ

۹۹

لب بر لبِ کوزہ ہیچ دانی مقصود؟
یعنی لبِ من نیز چو لبہائی تو بود
آخر چو وجودِ من نماند موجود
ہیہات! چنیں شود بفرمانِ ودود

۹۹

لب سے تھے مرے یوں لبِ کوزہ گویا
میں بھی تھا تری طرح خوشی کا جویا
یہ لب جو ترے ہیں کل وہ میرے ہوں گے
یہ سن کے ہنسا جو میں تو کوزہ رویا



دی کوزہ گری دیدم اندر بازار
بر پای گِل لگدہمی زد بسیار
واں گِل بزبانِ حال بااو میگفت
من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار



کل میں جو گیا کوزہ گروں کے بازار
دیکھا انہیں مٹی کا کچلتے انبار
آتی تھی صدا "یوں نہ اچھل یوں نہ کچل
میں بھی تری طرح اے مردم آزار



این کوزہ گران کہ دست درِ گل دارند
عقل و خرد و ہوش بران نگمارند
مشت و لکد و طمانچہ تا چند زنند
خاک بدن است تا چہ می پندارند



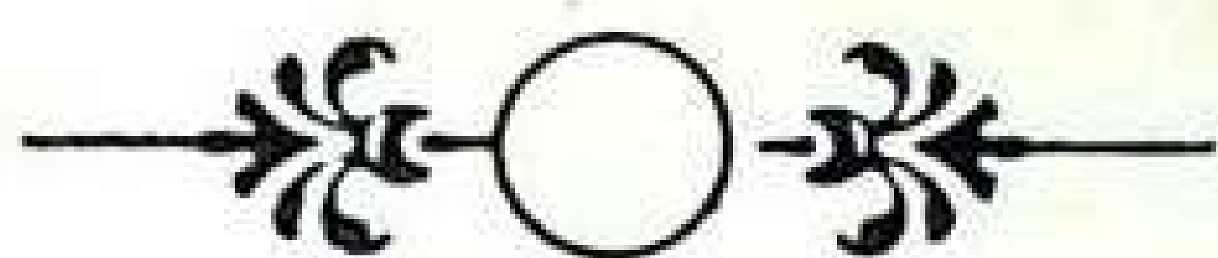
اے کوزہ گرو شوق سے مٹی سانو
بے ہوش و خرد یہ نہیں، اتنا جانو
مارو نہ اسے لات طمانچے گھونسے
یہ ہے کسی انساں کا بدن نادانو



ای کوزه گر بکوش گر هشیاری
تا چند کنی بر گلِ آدم خواری!
انگشتِ فریدون و سرِ کیخسرو
بر چرخ نهاده ای چه پنداری

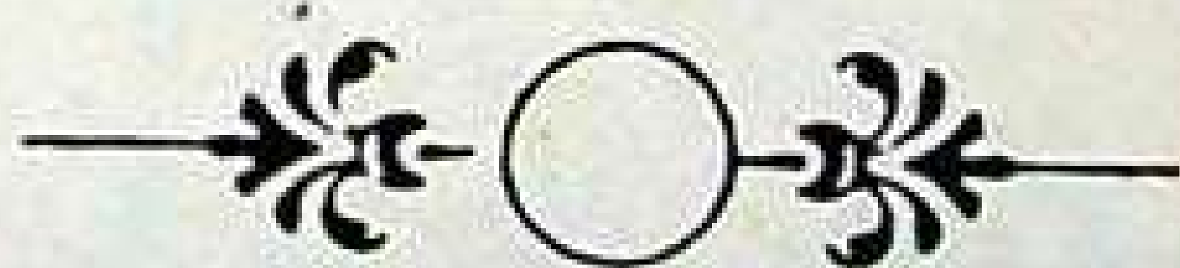


اے کوزہ گرو! تم کو ذرا بھی ہے خبر
دیتے ہو کسے چاک پہ اتنے چکر
وا دیدۂ باطن کو کرو اور دیکھو
انگلی یہ فریدوں کی ہے خسرو کا یہ سر



اِمروز

فکر آج کی کر کہ بیش قیمت ہے یہی
فردا تو فسانہ ہے حقیقت ہے یہی
ممکن ہے لگے نہ کوئی کل کی قیمت
جو لمحہ ترے پاس ہے دولت ہے یہی





امروز ترا دسترس فردا نیست
و اندیشۂ فردات بجز سودا نیست
ضائع مکن این دم ار دلت شیدا نیست
لیکن باقی عمر را بہا پیدا نیست



فکر آج کی کر کہ بیش قیمت ہے یہی
فردا تو فسانہ ہے، حقیقت ہے یہی
ممکن ہے لگے نہ کوئی کل کی قیمت
جو لمحہ ترے پاس ہے دولت ہے یہی



روزی کہ ز تو گذشتہ شد یاد مکن
فردا کہ نیامدہ است، فریاد مکن
از آمدہ و بگذشتہ خود یاد مکن
حالی خوش باش و عمر برباد مکن



جو دن گیا ہاتھوں سے اسے یاد نہ کر
فردا کے لیے قلب کو ناشاد نہ کر
کیا کھویا ہے کیا پایا ہے ان فکروں میں
جو پاس ہے لمحہ اسے برباد نہ کر

(۱۰۵)

این قافلۂ عمر عجب می گزرد
دریاب دمی کہ با طرب می گزرد
ساقی! غمِ فردای قیامت چہ خوری
پیش آر پیالہ ای کہ شب می گزرد

(۱۰۵)

لے کر طرب و عیش کے لمحات چلی
یہ عمرِ رواں تیزی سے ہیہات چلی
ساقی غمِ فردائے قیامت کیا
لا جلد دے پیالہ مجھے وہ رات چلی

(۱۰۶)

افسوس کہ نامۂ جوانی طے شد
وین تازہ بہارِ شادمانی طی شد
واں مرغ طرب کہ نام او بود شباب
فریاد کہ کی آمد و ندانم کی شد

(۱۰۶)

جھپکی جو پلک پھر وہ خزانہ ہی نہ تھا
صد حیف! جوانی کا زمانہ ہی نہ تھا
اے مرغِ طرب کہ نام تیرا ہے شباب
چپکے سے یوں جانا تھا تو آنا ہی نہ تھا

۱۰۷

از منزلِ کفر تا بہ دین یک نفس است
از عالم شک تا بہ یقین یک نفس است
دین یک نفسِ عزیز را خوش دار
کہ حاصلِ عمرِ باہمیں یک نفس است

۱۰۷

ہے کفر سے دین ازلی ایک نفس
اور شک سے یقین تک ہے وہی ایک نفس
یہ ایک نفس تو جو گزارے ہنس کر
پھر عمر کا حاصل ہو یہی ایک نفس

۱۰۸

چون عہدہ نمی شود کسی فردا را
حالی خوش دار این دلِ پر سودا را
می نوش بہ ماہتاب ای ماہ کہ ماہ
بسیار بتابد و نیابد ما را

۱۰۸

فردا کبھی آیا نہ کبھی آئے گا
ہنس کھیل کہ یہ پل بھی گزر جائے گا
پی چاندنی راتوں میں تو اے چاند کہ چاند
چمکے گا بہت، ہم کو نہیں پائے گا

۱۰۹

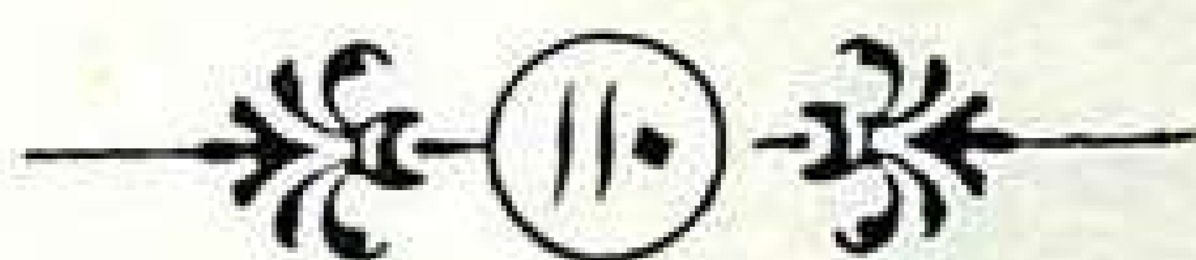
چوں میگزرد عمر چہ شیریں و چہ تلخ
پیمانہ چو پر شد چہ بغداد و چہ بلخ
مَی نوش کہ بعد از من و تو ماہ بسی
از سلخ بغرہ آید و از غرہّ بہ سلخ

۱۰۹

لے نقد کہ کل اس کا بھی ٹوٹا ہو گا
جو آج کھرا ہے کل وہ کھوٹا ہو گا
پی لے کہ کئی بار یہ چاند اپنے بعد
چھوٹے سے بڑا، بڑے سے چھوٹا ہو گا



ہر کو رقمی ز عقل در دل بنگاشت
یک لمحہ ز عمرِ خویش ضائع نگذاشت
یا در طلبِ رضای یزداں کوشید
یا راحت خود گزید و ساغر برداشت



توکل کے لیے رکھ نہ کوئی کام اُٹھا
بس وقت سے مختر اسی ہنگام اُٹھا
یا جا کے کسی غار میں کر یادِ خدا
یا شوقِ طرب ہو تو ابھی جام اُٹھا



چوں آبِ جوئبار و چوں باد بہ دشت
روزِ دگر از عمرِ من و تو بگذشت
تا من باشم غمِ دو روزہ نخورم
روزی کہ نیامدہ است، روزی کہ گذشت



بہتے ہوئے پانی کی طرح، مثلِ ہوا
اک بار جو پل بیت گیا، بیت گیا
جو آ کے چلا جائے نہ رو اس دن کو
جو دن ابھی آیا نہیں، غم اس کا نہ کھا



مَی نوش کہ عمرِ جاودانی اینست
خود خاصیت از دورِ جوانی اینست
ہنگامِ گل و مل ست و یاران سرمست
خوش باش دمی کہ زندگانی اینست



پی لے کہ حیاتِ جاودانی یہ ہے
خود خاصیتِ دورِ جوانی یہ ہے
ہنگامِ گل و مل ہے، احبّا سرمست
پل بھر تو چہک کہ زندگانی یہ ہے

جبرِ مشیّت

تقدیر کو روتی ہوئی تدبیریں ہیں
کیا خاک چلیں پاؤں میں زنجیریں ہیں
سورج ہے چراغ وقت فانوس خیال
ہم اس میں بدلتی ہوئی تصویریں ہیں

۱۱۳

آغاز رواں گشتنِ ایں زریں طاس
وانجام خرابی چنیں نیک اساس
دانستہ نمی شود بمعیارِ عقول
سنجیدہ نمی شود بمقیاسِ قیاس

۱۱۳

کس وقت پڑی گنبدِ گرداں کی اساس
کس وقت الٹ جائے گا یہ زریں طاس
جانا نہیں جا سکتا بہ معیارِ خرد
تولا نہیں جا سکتا بہ میزانِ قیاس

۱۱۴

آنہا کہ محیطِ فضل و آداب شدند
در کشفِ علوم شمعِ اصحاب شدند
رہ زیں شبِ تاریک نبردند بروں
گفتند فسانہ و در خواب شدند

۱۱۴

جو وسعتِ افلاک میں کھو جاتے ہیں
سرتاجِ علومِ دیں جو ہو جاتے ہیں
وہ بھی تو گھٹاٹوپ اندھیروں میں گھرے
افسانہ سناتے ہوئے سو جاتے ہیں

۱۱۵

نیکی و بدی را کہ در نہادِ بشر است
شادی و غمی کہ در قضا و قدر است
با چرخ مکن حوالہ کاندر رہِ عقل
چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است

۱۱۵

نیکی و بدی کو کہ ہیں اعمالِ بشر
شادی و غمی کو کہ ہیں قسمت کے ثمر
تو چرخ سے منسوب نہ کر ان کو کہ چرخ
ہے تجھ سے بھی لاکھ بار بیچارہ تر



جز حق حکمی کہ حکم را شاید نیست
ہستی کہ ز حکم او بروں آید نیست
ہر چیز کہ ہست آں چناں می باید
آں چیز کہ آن چنان نمی باید نیست



ہو حکم پہ کیا ترے چناں اور چنیں
جو حکم سے باہر ہو ترے ہے بھی کہیں؟
جس چیز کو جس طرح سے ہونا تھا ہے
جس چیز کو جس طرح نہ ہونا تھا نہیں



از روی حقیقت نہ از روی مجاز
ما لعبت گانیم و فلک لعبت باز
بازیچہ ہمیں کنیم بہ نطع وجود
رفتیم بہ صندوق عدم یک یک باز



حق بات ہے، انداز مجازی ہے مگر
کٹھ پتلی ہیں ہم اور فلک بازی گر
دکھلا کے تماشا ہم بھی اک اک کرکے
چھپ جاتے ہیں صندوقِ عدم کے اندر



ایں چرخِ فلک کہ ما درو حیرانیم
فانوسِ خیالی ازو مثالی دانیم
خورشید چراغدان و عالم فانوس
ما چوں صُوَریم کاندرو گردانیم



تقدیر کو روتی ہوئی تدبیریں ہیں
کیا خاک چلیں پاؤں میں زنجیریں ہیں
سورج ہے چراغ، وقت فانوس خیال
ہم اس میں بدلتی ہوئی تصویریں ہیں

(۱۱۹)

آورد باضطرارم اوّل بوجود
جز حیرتم از حیات چیزی نفزود
رفتیم باکراہ و ندانیم چہ سود
زین آمدن و بودن و رفتن چہ بود

(۱۱۹)

بے بس تھا، چلا آیا مرا آنا کیا
آکر نہ یہ سمجھا کہ ہے افسانہ کیا
پھر لوٹ گیا مگر یہ عقدہ نہ کھلا
یہ آنا، ٹھہرنا یہ پلٹ جانا کیا؟

۱۲۰

آنہا کہ بکارِ عقل در می کوشند
افسوس کہ جملہ گاوِ نر می دوشند
آن بہ کہ لباس ابلہی در پوشند
کامروز بعقلِ تیرہ می بفروشند

۱۲۰

اے اہلِ خرد کیسے تمھارا ہو گزر
اس پار، جہاں مارے پرندہ بھی نہ پر
بہتر ہے بنا کے بھیس اوباشوں کا
میخانے میں تم شراب بیچو جاکر

(۱۲۱)

من می خورم و ہر کہ چو من اہل بود
می خوردنِ من بہ نزد او سہل بود
می خوردنِ من حق زازل میدانست
گر می نخورم علمِ خدا جہل بود

(۱۲۱)

جو اہل ہے مجھ سا وہ بتا دے گا کیوں!
بے کھٹکے یوں آرام سے میں پیتا ہوں!
میں علمِ خدا میں ہوں ازل سے مے نوش
مے چھوڑ کے کیا علمِ خدا جھٹلا دوں؟

۱۲۲

یارب تو جمالِ آن مہِ مہر انگیز
آراستہ ای بہ سنبلِ عنبر بیز
پس حکم ہمی کنی کہ در وی منگر
ایں حکم چنان بود کہ "کج دار و مریز"

۱۲۲

پیدا کیا پہلے تو مہِ مہر انگیز
پھر آتشِ جذبات بھی کی دل میں تیز
پھر حکم ہوا دیکھوں نہ اس کو زنہار
یہ حکم تو ایسا ہے کہ "کج دار و مریز"

۱۲۳

چون ز آب و گِل آفرید صانع ما را
کردہ بغمِ زمانہ قانع ما را
پیوستہ مرا زمی ہمی منع کنی!
خود دستِ تہی بس است مانع ما را

۱۲۳

جب ڈھال چکا شکل میں صانع ہم کو
قسمت پہ کیا الم کی قانع ہم کو
پینے سے ہمیں روکنے والے تم کون
خود دستِ تہی جب آئے مانع ہم کو

۱۲۴

مَی گرچہ حرامست مدامش مینوش
با نغمۂ چنگ صبح و شامش مینوش
جامی زمیِ لعل ترا دست دہد
یک قطرہ رہا مکن تمامش مینوش

۱۲۴

ہے تیری حرام شے سے یاری، پی جا
کرنا جو ہے دل پہ کیف طاری، پی جا
قسمت سے جو مل جائے تجھے ایک بھی جام
اک قطرہ نہ چھوڑ باقی، ساری پی جا!

مسلکِ رندی

اے مفتیِ دیں تجھ سے ہے دنیا بیزار
پیتا ہوں مگر میں نہیں مردم آزار
تو سب کا ، میں انگور کا پیتا ہوں لہو
انصاف سے کہہ کس کو کہیں گے خونخوار

۱۲۵

یک دست بمصحفیم و یک دست بجام
گہ مردِ حلالیم و گہی مردِ حرام
مائیم دریں گنبدِ فیروزہ نام
نی کافرِ مطلق، نہ مسلمانِ تمام

۱۲۵

اک ہاتھ میں قرآن ہے اک ہاتھ میں جام
ہیں جمع مری ذات میں کفر و اسلام
شاہد ہے مرا گنبدِ فیروزہ فام
ہیں کافرِ مطلق، نہ مسلمانِ تمام

١٢٦

نی لائقِ مسجدم نہ درخورِ کنشت
ایزد داند گلِ مارا چہ سرشت
چوں کافرِ درویشم و چوں قحبۂ زشت
نی دین و نہ دنیا و نہ امیدِ بہشت

١٢٦

میں لائقِ مسجد نہ سزاوارِ کنشت
جانے تو خدا جانے مری کیا ہے سرشت
جوں کافرِ قلّاش و زنِ قحبہ زشت
قسمت میں مری دیں، نہ دنیا نہ بہشت



قومی متفکر اند در مذہب و دین
قومی متحیر اند در شک و یقین
ناگاہ منادی ای بر آمد ز کمین
کای بیخبران راہ نہ آنست نہ این



اک قوم ہے اس فکر میں کیا چیز ہے دیں
اک قوم ہے حیرت زدہ شک و یقیں
ناگاہ صدا آئی کہ اے نادانو
رک جاؤ کہ یہ راہ نہیں، وہ بھی نہیں

۱۲۸

قومی زگزاف در غرور افتادند
قومی بہ پیٔ حور و قصور افتادند
معلوم شود چوں پردہ ہا بردارند
کز کوئی تو دور دور افتادند

۱۲۸

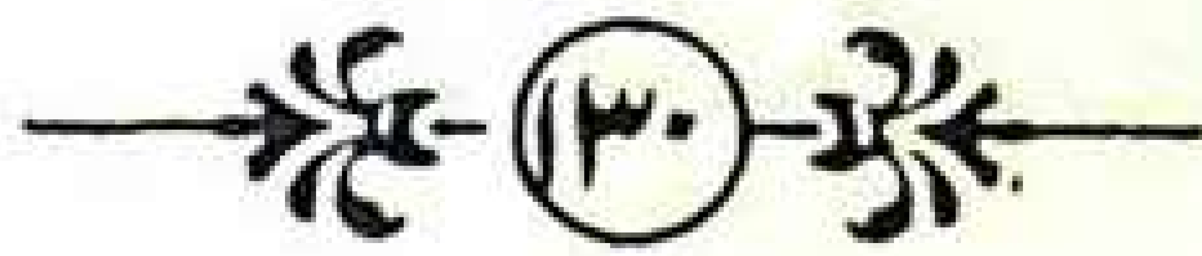
کچھ لوگ ہیں بیہوش سرِ طور پڑے
کچھ لوگ ہیں مست نگہہِ حور پڑے
جب پردہ اٹھے گا تو یہ ہوگا معلوم
کوچے سے ترے تھے یہ بہت دور پڑے

۱۲۹

شیخی بزنِ فاحشہ گفتا "مستی،
از خیر گسستی و بہ شر پیوستی"
زن گفت "چنانکہ مینمایم ہستم
تو نیز چنانکہ مینمائی ہستی؟"

۱۲۹

اک پیر نے کسبی سے کہا "اے کسبی
کس درجہ ہے مکروہ روش یہ تیری"
بولی "میں وہی ہوں جو نظر آتی ہوں
کیا تو جو نظر آتا ہے ویسا ہے بھی؟"



یک جرعہ مَی زِ مُلکِ کاؤس بہ است
از تختِ قباد و مملکتِ طوس بہ است
ہر نالہ کہ رندی بسحرگاہ زند
از طاعتِ زاہدانِ سالوس بہ است



مَے اچھی ہے یا مملکتِ طوس اچھی
جام اچھا ہے یا حکمتِ معکوس اچھی
رندوں کی فغانِ صبحگاہی بہتر
یا طاعتِ زاہدانِ سالوس اچھی



رفتم بخرابات بایمانِ درست
زنار مغان را بمیان بستم چست
شاگردِ خرابات زِبد نامیٔ من
رختم بدر افگند و خرابات بشست



بدنام زمانہ جو مجھے کل پایا !
خود پیرِ مغاں اٹھ کے مرے پاس آیا
میخانے سے فی الفور نکالا مجھ کو
میخانے کا پھر فرش تلک دھلوایا



سرمست زمیخانہ گزر کردم دوش
پیری دیدم مست و سبوی بر دوش
گفتم "زخدا شرم نداری ای پیر!"
گفتا "کرم از خداست مَی نوش و خموش"



کل ایک بزرگ آئے نظر کوزہ بدوش
رستے سے چلے جاتے تھے مست و مدہوش
میں نے کہا "اللہ سے ڈر اے بڈھے"
بولا کہ "کرم ہے اس کا پی اور خاموش"



ما خرقۂ زہد در سرِ خُم کردیم !
وز خاکِ خرابات تیمّم کردیم
باشد کہ درونِ میکدہ دریابیم
عمری کہ درونِ مدرسہ گم کردیم



خرقے کو نچھاور مَیں سرِ خُم کر کے
مے خانے کی مٹّی سے تیمّم کر کے
اس عمر کو ڈھونڈتا ہوں میخانے میں
آیا ہوں جسے مدرسے میں گم کر کے

۱۳۳

در مسجد اگرچه با نیاز آمده ام
حقا که نه از بهر نماز آمده ام
زین جا روزی سجاده ای دزدیدم
آن کهنه شده است باز آمده ام

۱۳۴

صف باندھ کے مسجد میں ہوں ہر چند کھڑا
پر مجھ کو نہ سمجھو کہ نمازی ہوں بڑا
مسجد سے چرایا تھا مصلیٰ اک روز
وہ ہو گیا بوسیدہ تو آنا ہی پڑا

١٣٥

گرمی نخوری طعنہ مزن مستاں را
گر دست دہد توبہ کنم یزداں را
تو فخر بدیں کنی کہ من می نخورم
صد کار کنی کہ می غلامست آں را

١٣٥

مستوں کو نہ دے طعنہ جو مے تجھ کو نہ بھائے
ہم توبہ بھی کر لیں گے کبھی دھن جو سمائے
اتراتا ہے کیوں اتنا کہ پیتا نہیں تو
سو کام ترے وہ جس سے مئے کو گھن آئے



افتادہ مرا بامیٔ و مستی کاری
خلقم زچہ می کنند ملامت باری
ای کاشکی ہر حرام مستی کردی
تا من بجہان ندیدمی ہشیاری



ہے مے میں نشہ اس لیے ہم ہیں بدنام
کرتے ہیں ملامت ہمیں دن رات عوام
دنیا میں نہ باہوش نظر آئے کوئی
اے کاش نشہ لائے ہر اک کارِ حرام

۱۳۷

ہاں! تا ہر مستان بدرشتی نشوی
یا از درِ نیکواں بزشتی نشوی
مَی خور کہ خوردن و ناخوردن میَ
گر در خورِ دوزخی، بہشتی نشوی

۱۳۷

مستوں کو حقارت سے نہ دھتکار کبھی
نیکوں کے نہ ہو درپۓ آزار کبھی
پی لے کہ پئیں یا نہ پئیں جنت میں
جائیں گے نہ دوزخ کے سزاوار کبھی

(۱۳۷)

فاسق خوانند مردمانم پیوست
من بی گُنہم خیال شان بین کہ چہ ہست
بر من خلافِ شرعِ ای اہلِ صلاح
جز خمر و لواطت و زنا چیزی ہست

(۱۳۸)

فاسق مجھے کہہ کے خدارا نہ ستا
مت اپنی فضیلت اے ریاکار جتا
بس اک مئے و معشوق پرستی کے سوا
مجھ پر کوئی الزام اگر ہو تو بتا

۱۳۹

عمریست کہ مداحِ مے و ردِ منست
واسباب می است آنچہ در گردِ منست
زاہد اگر استادِ تو عقل است اینجا
خوش باش کہ استادِ تو شاگردِ منست

۱۳۹

واعظ میں سمجھتا نہیں پینے کو بُرا
پینے سے ڈراتا ہے مگر کام ترا
گر پیرِ خرد ہے ترا استاد تو سُن
تیرا ہی استاد ہے شاگرد مرا



ای مفتیِ شہر از تو پُرکار تریم !
با این ہمہ مستی از تو ہشیار تریم
تو خونِ کسان خوری و ما خونِ رزی !
انصاف بدہ، کدام خونخوار تریم



اے مفتیٔ دیں تجھ سے ہے دنیا بیزار
پیتا ہوں مگر میں نہیں مردم آزار
تو سب کا، میں انگور کا پیتا ہوں لہو
انصاف سے کہہ، کس کو کہیں گے خونخوار



با ما فلک ار جنگ ندارد عجب است
گر بر سرِ ما سنگ ندارد عجب است
قاضی کہ خرید بادہ وقف و فروخت
در مدرسہ گر بنگ ندارد عجب است



اچھوں سے کرے جنگ تو حیرت کیا ہے
بدلے وہ کئی رنگ تو حیرت کیا ہے
اوقاف کا جو مال خریدے بیچے!
مکتب میں رکھے بھنگ تو حیرت کیا ہے

۱۴۲

در مجلسِ دہر سازِ مستی پست است
نی چنگ و نای نہ دلم در دست است
رندان ہمہ ترکِ می پرستی کردند
جز محتسبِ شہر کہ دائم مست است

۱۴۲

اک قطرہ نہیں شراب کھانے کو قسم
آتی ہے صدائے ساز مدھم مدھم
اس شہر میں میخوار ملے گا نہ کوئی
جز محتسبِ شہر کہ دھت ہے ہر دم



از دهر هر آن که نیم نانی دارد
وز بهر نشست آستانی دارد
نی خادم کس بود، نه مخدوم کسی
گو شاد بزی که خوش جهانی دارد



کھانے کو اگر نانِ جویں رکھتا ہے
رہنے کو جو گز بھر بھی زمیں رکھتا ہے
خادم ہے نہ مخدوم کسی کا تو اگر
جا خوش ہو کہ دنیائے حسیں رکھتا ہے



مَی خوردنِ من نه از برای طرب است
نَی بهرِ نشاط و ترکِ دین و ادب است
خواهم که دمی ز خویشتن باز رهم
مَی خوردن و مست بودنم زان سبب است



پینے سے ہو مقصود طرب تو کافر
یا ترک کروں دین و ادب تو کافر
پیتا ہوں کہ میں خود کو بھلا دوں یکسر
پینے کا ہو کچھ اور سبب تو کافر

مجبُوب

بلبل کو ہے جس قدر یہ گلزار عزیز
ہے اس سے سوا مجھ کو تو اے یار عزیز
کہتے ہیں کہ ہے سب سے عزیز اپنی جان
اے جاں تو مری جاں سے بھی سو بار عزیز

۱۴۵

من گوھر خود بقیمت کم ندہم
دردِ تو بہزار مرھم ندہم
خاک در تو بملکت جم ندھم
یک موی ترا بہر دو عالم ندہم

۱۴۵

لی دولتِ کونین ترا غم لے کر
دوں دردِ ترا نہ لاکھ مرھم لے کر
کرنا بھی ہے کیا مملکتِ جم لے کر
سایہ بھی ترا دوں نہ دو عالم لے کر

(۱۴۶)

ای آنکه گزیدهٔ جہانی تو مرا
خوشتر زدل و دیدہ جانی تو مرا
از جانِ صنما عزیز تر چیزی نیست
صد بار عزیز تر از انی تو مرا

(۱۴۶)

بلبل کو ہے جس قدر یہ گلزار عزیز
ہے اس سے سوا مجھ کو تو اے یار عزیز
کہتے ہیں کہ ہے سب سے عزیز اپنی جاں
اے جاں! تو مری جاں سے بھی سو بار عزیز



بر پای تو بوسہ دادن ای شمع طرب
بہ زان باشد کہ دیگراں بر لب
دستِ من و دامنِ خیالت ہر روز
پای من و جستنِ وصالت ہر شب



ہیں ہاتھ مرے اور ترا دامانِ خیال
ہیں پاؤں مرے اور تری بزم وصال
بوسہ جو میسر ہو ترے قدموں کا
پھر اوروں کے ہونٹوں کا بھی بوسہ ہے وبال

۱۴۸

جاناں ! بکدام دست برخاستہ ای
کز طلعتِ خویش ماہ را کاستہ ای
خوبانِ جہاں بعید رو آرایند
تو عید بروی خویش آراستہ ای

۱۴۸

کس ہاتھ نے ڈھالا تجھے اے ماہ جبیں
کٹ جائے جو دیکھے تجھے ماہِ سیمیں
خوبانِ جہاں عید کو کرتے ہیں سنگھار
اور عید ہے خود تیری بدولت رنگیں

۱۴۹

اسرار ازل بادہ پرستان دانند
قدرِ مَی و جام تنگ دستان دانند
گر چشمِ تو حال من بداند چہ عجب
شک نیست کہ حالِ مست مستان دانند

۱۴۹

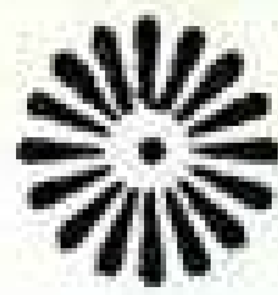
اسرارِ ازل بادہ پرستوں سے پوچھ
قدرِ مئے و جام تنگ دستوں سے پوچھ
واقف ہیں مرے حال سے آنکھیں تیری
مستوں کے دلوں کے راز مستوں سے پوچھ

۱۵۰

با زلفِ تو گر دست درازی کردم
از روی حقیقت نہ مجازی کردم
در زلف تو دیدم دلِ دیوانۂ من
من با دلِ خویش دستبازی کردم

۱۵۰

زلفوں سے تری جو کھینچا تانی کی ہے
تقصیر یہ کب میری جوانی کی ہے
زلفوں میں تری تھا دلِ دیوانہ مرا
میں نے تو اسی سے چھیڑ خانی کی ہے



اکیلا درخت

ڈاکٹر عصمت جاوید

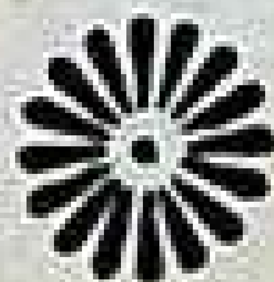
کی غزلوں کا مجموعہ ہے

○ بقول شیخ محمد ابراہیم خیالؔ جو عصمت جاوید کے دیباچہ نگار ہیں عصمت غزل کے روایتی شاعر نہیں ہیں جو صرف گل و بلبل اور گیسو و عارض سے ہی الجھے رہیں۔ انھوں نے اس خلائی دور میں ستاروں پر کمندیں ڈالی ہیں۔

○ بقول اسعد گیلانی عصمت جاوید ایک وہبی شاعر ہیں جن کو شعر گوئی کا سلیقہ فطرت نے وافر مقدار میں ودیعت کیا اور ان کے علم نے اس صنف میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی ہے۔

○ بقول پروفیسر آسی ضیائی رام پوری عصمت جاوید کے اشعار پڑھ کر کلاسیکی شاعرانہ ماحول کا موجودہ ماحول میں لطف آتا ہے۔

ضخامت : ۱۴۸



مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر



فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

969 0 01016 6

Rs. 80.00